مولانا مملوک علی نانوتوی

پروفیسر محمد ایوب قادری

استاذ العلماء مولانا مملوک علی بن شیخ احمد علی نانوتہ ضلع سہارنپور میں تقریباً ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے[1] مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن نانوتہ میں حاصل کی اس کے بعد تحصیل علم کی غرض سے دہلی پہنچے اس زمانے میں دہلی علوم مشرقی کا خاص مرکز تھا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نامور صاحبزادگان شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ مولانا مملوک علی نے تبرکاً حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں ہدایۃ النحو کے کچھ اسباق پڑھے پھر شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین کے تلمیذ خاص مولانا رشید الدین خاں کی خدمت میں جملہ علوم متداولہ کی تحصیل کی اور اپنے ہم عصر علماء میں مشہور و معروف ہوئے[2] خیال

---

[1] مولانا مملوک علی کے تلمیذ مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء) نے ۱۸۴۷ء میں مولانا مملوک علی کی عمر کا اندازہ تقریباً ساٹھ سال لگایا ہے (تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۶۴ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء) اسی تخمینہ کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے قبول کیا ہے (سوانح قاسمی جلد اول ص ۱۰۱)

[2] یہ تعجب ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سید احمد شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (ف ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کے فیوض و برکات کا یہ نتیجہ قرار دیا ہے کہ جب ان بزرگوں نے نانوتہ وغیرہ بستیوں میں دورے کئے تو وہاں خاطر خواہ اثر ہوا اور مولانا مملوک علی وغیرہ دہلی تحصیل علم کی غرض سے گئے (سوانح قاسمی جلد اول ص ۸۱-۹۱) حالانکہ سید احمد شہید کی پیدائش ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء اور حاجی امداد اللہؒ کی پیدائش ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء کی ہے جب سید احمد شہیدؒ نے ان علاقوں میں دورہ کیا تو مولانا مملوک علی دہلی میں مسند درس پر متمکن تھے اور جب حضرت حاجی امداد اللہؒ نے رشد و ہدایت کی شمع روشن کی ہوگی تو مولانا مملوک علی جوانی کی منزلیں طے کر چکے ہوں گے

یہ ہے کہ تحصیل علم کے بعد مولانا مملوک علی نے دہلی ہی میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ہوگا اور جب ۱۸۲۵ء میں دہلی کا مشہور مرکز علم مدرسہ غازی الدین "دہلی کالج" میں تبدیل ہوگیا[1] تو مولانا رشید الدین سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر عربی کے صدر مدرس مقرر ہوتے اور مولانا مملوک علی کا نائب مدرس کی حیثیت سے پچاس روپے ماہوار پر تقرر ہوا۔ مولانا مملوک علی کے تقرر کی تاریخ یکم جون ۱۸۲۵ء ہے[2]

نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) لکھتے ہیں[3]

"از اعیان دہلی بودند تلمذ ایشان در علوم درسیہ با مولوی رشید الدین خان است و از طرف فرنگیاں تدریس درجہ اول مدرسہ دہلی بایشان تعلق داشت۔"

وہ دہلی کے اکابر میں سے تھے اور علوم درسیہ میں مولوی رشید الدین خاں کے شاگرد تھے مدرسہ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جماعت اول (عربی) کو پڑھانے کے لئے مقرر تھے۔

---

[1] مدرسہ غازی الدین فیروز جنگ المتوفی ۱۷۱۰ء (والد نظام الملک آصف جاہ اول) نے اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی پاس ہی مقبرہ بنوایا جہاں خود دفن ہوئے۔ اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" (۲۴) میں مدرسہ غازی الدین کا بانی فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ۱۸۲۹ء میں دہلی کالج کی مالی حالت بہت درست ہوگئی کیونکہ اعتماد الدولہ فضل علی خان وزیر شاہ اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم اس درسگاہ کے لئے وقف کی اور انکے داماد نواب حامد علی خاں نگراں اور متولی مقرر ہوتے۔ ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۳۳۴ و مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

[2] رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۱۸۴۲-۴۳ء، دہلی کالج سے متعلق رپورٹوں کے اصل اقتباسات ہمیں جناب رضیہ بشیر صاحبہ کے ذریعہ سے ملے جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں وہ دہلی پر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔

[3] تاریخ قنوج (قلمی) از نواب صدیق حسن خاں ص ۱۰۰ (مرتبہ ۱۲۷۰ھ) (مخزونہ مسلم یونیورسٹی لائبریری، حبیب گنج کلیکشن)

× شاید یہ جارچوی کا خاندان ہو؟

مشہور لتقیہ لیڈر ہیں؟

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (ف ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں[1]

"اخذ عن الشیخ رشید الدین تقدم فی العربیۃ والفقہ وفنون التحصیل علی علماء عصرہ ونصب مدرساً فی "دھلی کالج" بعد شیخہ مولانا رشید الدین"

انھوں نے شیخ رشید الدین سے علوم حاصل کئے اور اپنے ہم عصر علماء میں عربی، فقہ اور فنون تحصیل میں سبقت لے گئے، اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوتے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ اپنے شیخ مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے بلکہ مولانا مملوک علی اور ایک دوسرا استاد مولوی سید محمد مولانا رشید الدین کے ساتھ ہی نائب مدرسین کی حیثیت سے دہلی کالج میں ملازم ہوئے تھے۔

اس کے بعد شعبہ عربی میں دو اور مدرس مقرر ہوئے مولوی سدید الدین بن مولوی رشید الدین کا ۳۰ راکتوبر ۱۸۳۰ء کو اور مولوی سبحان بخش شکارپوری کا ۵ راکتوبر ۱۸۳۴ء کو اس شعبہ میں تقرر ہوا۔[2]

مسٹر ٹامس وزیٹر دہلی کالج نے ۸ رنومبر ۱۸۴۱ء کو ایک رپوٹ میں مولوی مملوک علی کے اضافۂ تنخواہ کی سفارش کی کہ ان کو اسی روپے ماہوار تنخواہ ملنی چاہیئے۔[3] بالآخر مولانا کو ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی اس دوران میں نواب حامد علی خان نے مولوی جعفر علی[4] کو سو روپے ماہوار پہ کالج میں ملازم رکھ لیا۔ اور کوشش یہ کی کہ ان کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ مولانا مملوک علی پندرہ سولہ سال

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از عبید اللہ سندھی ۱۸۱۴ (کتاب خانہ پنجاب لاہور ۱۹۴۲ء)

[2] رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۳-۱۸۴۲ء

[3] رپورٹ جنرل کمیٹی مورخہ ۸ رنومبر ۱۸۴۱ء

[4] مولوی جعفر علی بن افضال علی قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر یوپی میں ۲ رصفر ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کو پیدا ہوئے لکھنؤ اور دہلی میں تحصیل علم کی فن قرأت کو خاص طور سے حاصل کیا وہ دہلی میں اہل شیعہ حضرات کی ایک جماعت کے مقتدا تھے اور مولوی محمد باقر دہلوی (مقتول ۱۸۵۷ء) کے حریف سمجھے جاتے تھے ان دونوں حضرات کی جماعتیں جعفری اور باقری کے نام سے مشہور ہیں ۸ رجب ۱۳۱۴ھ میں فوت ہوئے اور جارچہ میں دفن ہوئے (ملاحظہ ہو غالب اللہ قاری جعفری علی از صغیر اصغر جارچوی ماہ نو "کراچی فروری ۱۹۶۵ء)

سے کالج میں ملازم تھے ان کی حق تلفی ہوتی تھی کالج کے ارباب حل وعقد نے مفتی صدر الدین آزردہ سے اس مسئلہ میں رائے طلب کی انھوں نے مولانا مملوک علی کے علم وفضل کو سراہا اور ان کی سفارش کی مگر انتظامیہ نے نواب حامد علی خاں کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو علیحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور معاملہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا[۱] بالآخر ۸ رنومبر ۱۸۴۱ء کو مولانا مملوک علی صدر مدرس قرار پائے اور سو روپے ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر ہوا[۲] مسٹر ٹامسن نے مولانا مملوک علی کے لئے لکھا ہے[۳]

وہ عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں۔ اور شہر (دہلی) میں ان کا بہت احترام ہے۔

HE IS VERY GOOD ARABIC SCHOLAR AND VERY MUCH RESPECTED IN THE CITY.

مولانا جعفر علی ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج سے علیحدہ ہو گئے۔

مولانا مملوک علی کوچہ چیلان دہلی میں رہتے تھے انھوں نے اپنا ذاتی مکان بنالیا تھا۔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مولانا مملوک علی نے کالج سے رخصت حاصل کی اور حج کے لئے تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک سال اس مقدس سفر میں لگا۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں[۴]

"سن بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا ذیقعد میں شاید روانہ ہو گئے دہلی میں اندھیر ہو گیا' اور آپ صاحبان کے ساتھ ایک بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہ قدردانی

۱،۲،۳ رپورٹ جنرل کمیٹی ۱۳ر نومبر ۱۸۴۱ء (جنرل پروسیڈنگ جلد چہاردہم)

۴ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۹۴ (حاشیہ) (مطبع صادق الانوار بہاولپور ۱۲۹۷ھ)

> آدھی تنخواہ بھی دی رجب ۱۲۵۸ھ میں وطن سے روانہ ہوگئے اور
> اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں
> پھر دہلی پہنچے اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب سمجھا رخصت
> کے دن پورے ہوچکے تھے وطن نہ آسکے ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ
> ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب (محمد قاسم نانوتوی)
> کو دہلی ساتھ لے گئے"

مولانا مملوک علی خانوادۂ ولی اللہی کے فیض یافتہ اور مستفید تھے اور اسی خاندان سے ان کو نسبت تلمذ تھی۔ وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے اپنے انتقال تک تقریباً تہائی صدی سے زیادہ دہلی میں رہے اور ایک عالم و مدرس کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوتے۔ وعظ و تذکرہ اور تصنیف و تالیف سے کچھ تعلق نہ تھا[1] درسی ضرورت سے دو تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کا خاص میدان درس و تدریس تھا اور اس اعتبار سے وہ مشہور ہوئے کالج کے علاوہ طلباً کی ایک جماعت ان سے گھر پر بھی استفادہ کرتی تھی۔ دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد رہے کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک علی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقعہ پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک علی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵؍ ۷ارنومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا، ۷ارنومبر کے دربار میں ۷۲ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا مولانا مملوک علی مدرس اول کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسداللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر اور مفتی صدرالدین خاں بہادر صدر آزردہ دہلی کو خلعت سہ پارچہ اور گھنٹہ ملا[2] اس وقت انگریزی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم اور تعلیم ہندوستان کے مسلمانوں میں اور خاص طور

---

[1] آثار الصنادید از سر سید احمد خاں (باب چہارم، ۲۰۷ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

[2] دہلی کا آخری سانس (اقتباسات احسن الاخبار بمبئی ۱۸۴۴-۴۶ء) مترجمہ سید محمد صاحب ناصر دہلوی شائع کردہ خواجہ حسن نظامی دہلوی ص ۴۶ (حلقہ مشائخ دہلی ۱۹۲۵ء)

سے دہلی کے مسلمانوں میں مروج و مقبول ہو۔ اس مقصد میں گورنمنٹ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔
سی۔ ایف اینڈ ریوز لکھتے ہیں[1]۔

دہلی کی نشأۃ ثانیہ میں ایک اور امر جو عجیب و غریب دلچسپی دکھاتا تھا کہ شعبہ علوم مشرقیہ جو زیادہ تر عربی اور فارسی لٹریچر سے متعلق تھا بہت زیادہ ہر دلعزیز ہوگیا تھا ان جماعتوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دیجاتی تھی لیکن نئی انگریزی جماعتوں کی وجہ سے طلباء نے انھیں چھوڑ نہیں دیا تھا۔"

مولانا مملوک علی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں۔ اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی کہ جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں' مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (مدرس اجمیر کالج) مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج) مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان کے اعزہ و احباب ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۱ء) پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج) خواجہ محمد شفیع (جج) خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء) مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں کہ جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات سرانجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ محمد اسحاق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس کے صدر مولانا مملوک علی اور تین

---

[1] تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی از سی۔ ایف اینڈ ریوز ص ۷۶

دکن مولانا نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ) مولانا مظفر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ م ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (ف ۶ محرم ۱۲۹۵ھ) تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مملوک علی خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتہ شاہ محمد اسحاق کے معتمد و معتقد تھے۔ مگر ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل تو درکنار کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا۔ ان کی زندگی تو تمام تر درس و تدریس سے عبادت رہی ہے لہٰذا یہ صداقت کچھ محل نظر سی معلوم ہوتی ہے۔

مولانا مملوک علی نہایت متواضع، حلیم، بردبار اور منکسر المزاج تھے، وعظ و تذکیر کی عادت نہ تھی سادہ لباس پہنتے تھے[1] مولانا مظفر حسین اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (ف ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء) سے خاص تعلقات تھے مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں[2]

"جب حضرت مولوی صاحب (مظفر حسین کاندھلوی) دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن جاتے، کاندھلہ ہو کر جاتے، جب وطن سے لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال جناب حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا۔"

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی لکھتے ہیں[3]

"مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اول یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے اگر کہا کھا چکا تو پھر کچھ نہیں اور اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا تو مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوا دوں چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ

---

[1] آثار الصنادید ۷۰۴

[2] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ۱۲۳

[3] حالات مشائخ کاندھلہ از مولوی احتشام الحسن کاندھلوی ۳۴، ۳۵ (ادارہ اشاعت دینیات دہلی ۱۳۶۳ھ)

رکھا ہوا لادو اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی اسی کو لے آئے
اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی، انھوں نے کہا کہ بس یہی کافی ہے پھر
جب رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک
پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔[1]

یہ بزرگ خلوص و محبت اور تواضع و انکسار کا سراپا نمونہ تھے اللہ تعالےٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

مولانا مملوک علی ۱۲۵۹ھ میں حج سے سیدھے دہلی واپس آئے اور تعطیل کے موقعہ پر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ میں اپنے وطن نانوتہ گئے اور اپنے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کو تعلیم کی غرض سے اپنے ہمراہ دہلی لاتے اور وہاں نہایت توجہ سے ان دونوں کی تعلیم و تربیت کی ایک سال کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی (ف ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے ان اقطاب ثلاثہ کی تعلیم و تربیت مکمل ہو چکی تھی کہ مولانا مملوک علی کو پیام آگیا اور وہ گیارہ دن یرقان کے مرض میں مبتلا رہ کر ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء راہئی ملک بقا ہوئے[1] اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندانی قبرستان مہندیوں میں شیخ عبدالعزیز شکربار کے پائیں دفن ہوئے مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں[2]

"آپ کی قبر کچی ہے جب تک کوئی نہ بتائے مل نہیں سکتی ناقدردانیٔ
زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار
تھے مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک
ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے
والے فاتحہ تو پڑھ لیتے۔"

۱۳ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو پرنسپل دہلی کالج نے مولوی مملوک علی کے انتقال کے متعلق

---

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ۹۴

[2] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم از مولوی بشیر الدین احمد ۵۸۴

انتظامیہ کو اطلاع دی[1]۔ مولانا مملوک علی جماعت علماء میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک تھے سر سید احمد خاں لکھتے ہیں[2]۔

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینہ علم خالی ہو جاوے تو اُن کی لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے، ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و علم احاطہ تحریر سے افزوں تر ہے۔"

مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں[3]

"بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارتِ تامّہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں اُن کے ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔"

مولانا مملوک علی کی ذات مرجع طلباء تھی اکناف و اطراف سے طلبہ ان کی خدمت میں پہنچ کر استفادہ علمی کرتے تھے، کالج کے علاوہ فاضل اوقات میں ان کے گھر پر بھی طلبہ کا ہجوم رہتا تھا مولوی کریم الدین لکھتے ہیں[4]۔

---

[1] رپورٹ جنرل کمیٹی ۱۸۵۱ء

[2] آثار الصنادید ص ۷۰

[3] تذکرہ طبقات الشعراء ہند از مولوی کریم الدین ص ۴۶۳

[4] تذکرہ فرائد الدہر از مولوی کریم الدین ص ۲۰۷

"گھر اس کا محط الرحال طلباء مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے ...... سوا درس دہلی طلباً مدرسہ کے اپنے گھر پہ بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں ...... تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباً میں نصف شب تک منقسم ہے ..... ان کی فہرست میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔"

طلبہ مولانا مملوک علی سے مطمئن ہوتے تھے اور مولانا کے یہاں ان کی خاطر خواہ تشفی ہوتی تھی مولانا رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں[1]

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کر لیں گویا استاد نے گھول کر پلا دیا (مولانا رشید احمد) فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو۔ اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے رحمتہ اللہ علیہما۔"

مولانا مملوک علی کے طرز تدریس کے متعلق مولانا محمد یعقوب نانوتوی رقم طراز ہیں[2]

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ اول از مولوی عاشق الٰہی میرٹھی ۴ ۳۰-۳۱

[2] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ۱۸۴

"ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں"

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی تعداد کا استحصار ناممکن ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین۔ ایل ایل ڈی [1] ——— مولوی عالم علی مرادآبادی (ف ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء)، مولوی سمیع اللہ دہلوی [2]

---

[1] خان بہادر شمس العلماء مولوی شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے والد دادا عزیز شیخ محمد بخش موضع بسئی تحصیل دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ یہ خاندان گورنمنٹ کا خیر خواہ تھا غدر ۱۸۵۷ء میں (دادا عزیز شیخ محمد بخش) دھیرج کی پہاڑی پر خبر رسانی کرتے تھے۔ جب انگریزی فوج دلی میں داخل ہوئی تو دادا عزیز اپنے گھر میں تھے کہ ایک سپاہی کی گولی سے ڈھیر ہو گئے خبر رسانی کے صلہ میں کچھ اراضی انعام میں ملی ان کے فرزند مولوی ضیاء الدین نے مولانا مملوک علی اور منشی صدر الدین آزردہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ دلی کالج کے طالب علم رہے۔ پھر نارمل اسکول اور دلی کالج کے مدرس رہے جب ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج ٹوٹا تو اکسٹرا اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔

(واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ۱۷۹۴)

[2] مولوی سمیع اللہ خاں بن منشی عزیز اللہ ۱۸۳۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مولوی غلام محمد اور مولانا مملوک علی سے ان کے گھر پر تعلیم حاصل کی مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی پڑھا نومبر ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان پاس کیا اور کانپور میں منصف مقرر ہوئے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء تک آگرہ کی صدر دیوانی، صدر نظامت اور ہائی کورٹ میں وکالت کی ۱۸۷۲ء میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ علی گڑھ، الہ آباد، مرادآباد اور فتح گڑھ میں کارفرما رہے سر سید احمد خاں کی تعلیمی مہم میں شریک و معاون تھے مولوی سمیع اللہ خاں کی کوشش سے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا۔ ایک جلسہ میں بصدارت مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ مدرسہ علی گڑھ کے افتتاح کی رسم ادا کی گئی، مولوی صاحب نے میور سنٹرل کالج الہ آباد کے مسلم طلباء کے لئے

(باقی ص ۱۷۶ پر)

مولانا عبدالرحمان پانی پتی[۱] وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے مولانا مملوک علی کے تلامذہ میں سرسید احمد خان (ف ۱۸۹۸ء) ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) اور مولوی ذکاء اللہ (۷ نومبر ۱۹۱۰ء) کو بھی شامل کیا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سندھی نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے غالباً آخر الذکر حضرات کو تو اس لئے اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کہ یہ حضرات دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں مگر معلوم نہیں سرسید کو کسطرح ان کا شاگرد لکھ دیا۔ سرسید احمد خاں تو دہلی کالج کے طالب علم بھی نہیں رہے۔ سرسید خاں نے آثار الصنادید ۱۸۴۶ء میں مرتب کی اور اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے انہوں نے اس میں کہیں تلمذ کا ذکر نہیں کیا ہے[۲] اسی طرح حیات جاوید میں مولانا حالی نے ابتدائی تعلیم کا حال کم وبیش سرسید احمد خاں ہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے وہاں بھی سرسید احمد خاں نے مولانا مملوک علی کو

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۸) الہ آباد میں ایک بورڈنگ ہاؤس بنوایا جس کا افتتاح سر آکلینڈ کالون لفٹیننٹ گورنر یوپی کے ہاتھ سے ۱۱ مارچ ۱۸۹۲ء کو کرایا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۸۲ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استحکام کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۰۸ء کو دہلی میں فوت ہوئے۔

(سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں از مولوی ذکاء اللہ دہلوی مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن ۱۹۰۹ء)

[۱] قاری عبدالرحمٰن پانی پتی بن قاری محمدی نے مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی سے تحصیل علم کی اور صحاح ستہ کی سند شاہ محمد اسحاق سے لی۔ علم قرات قاری امام الدین امروہوی سے حاصل کیا، ۱۶ سال نواب ذوالفقار الدولہ رئیس باندہ کے مدرسہ میں مدرس رہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں باندہ میں مقیم تھے، ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو پانی پت میں انتقال ہوا (تذکرہ علمائے ہند ص ۵۷۷، ۵۷۸، مقالات شروانی از نواب حبیب الرحمان شروانی ص ۲۷۹ - ۲۸۲، تذکرہ رحمانیہ از خواجہ الطاف حسین حالی، مطبوعہ نقوش لاہور۔ اپریل ۱۹۵۳ء)

[۲] آثار الصنادید از سرسید احمد خاں ص ۲۰۷

اپنے اساتذہ میں شمار نہیں کیا ہے[1]۔

ڈپٹی نذیر احمد کے حالات حیات النذیر میں مفصل لکھے گئے ہیں۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں مولانا مملوک علی کا نام اس کتاب میں بھی شامل نہیں ہے ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء دہلی کالج میں طالب علم رہے[2] ابتدائی سالوں میں تو دوسرے اساتذہ کے پاس اسباق لیتے ہوں گے اور اکتوبر ۱۸۵۱ء کو مولانا مملوک علی کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے مولانا مملوک علی سے پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی ہو گی ورنہ حیات النذیر کے مؤلف اس کا ذکر ضرور کرتے۔

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ بھی تقریباً ۱۸۴۵ء ہی دہلی کالج میں داخل ہوئے ان کو فارسی سے خاص لگاؤ تھا انھوں نے اپنے استاد مولوی امام بخش صہبائی (ف ۱۸۵۷ء) کا بہت محبت سے ذکر کیا ہے ان کا خاص مضمون ریاضی تھا اور وہ ماسٹر رام چندر (ف ۱۸۸۰ء) کے خاص شاگرد تھے اور اس مضمون میں انھوں نے امتیاز و اختصاص بھی حاصل کیا ان کے اساتذہ میں کہیں مملوک علی کا نام نہیں آتا ہے[3]۔

حکیم عبدالحی (ف ــــــ) مؤلف نزہتہ الخواطر نے مولانا اشرف علی تھانوی سے روایت کی ہے کہ مولانا شیخ محمد تھانوی (ف ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء) نے علوم متعارفہ کی تحصیل مولانا مملوک علی سے کی تھی[4]۔

مولانا مملوک علی کا تمام وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا، دن اور رات ان کے یہاں طلباء کا ہجوم رہتا تھا لہٰذا تصنیف و تالیف کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ دہلی کالج کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج کی طرف سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا ان میں

---

[1] حیات جاوید از الطاف حسین حالی ۲۴-۲۵ (آگرہ ۱۹۰۳ء)

[2] حیات النذیر از افتخار عالم مارہروی ۳۴ (شمسی پریس دہلی ۱۹۱۲ء)

[3] تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی (سی۔ ایف۔ اینڈریوز) ترجمہ ضیاء الدین برنی ۷۴-۸۰ (تعلیمی مرکز، کراچی ۱۹۵۲ء)

[4] مرتبہ ثناء الحق ۲۲۴ (پاک اکیڈیمی، کراچی ۱۹۶۳ء) تحقیق وحدت الوجود والشہود

سے اکثر کی وہ نگرانی و نظر ثانی کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل کتابوں کے خود مولانا مملوک علی نے ترجمے کئے ہیں۔

۱۔ تحریر اقلیدس | ۱۸۴۴ء میں دہلی کالج کے پرنسپل کی تحریک پر تحریر اقلیدس کے اول کے چار مقالوں اور آخر کے گیارھویں اور بارھویں مقالوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

اس کے ترجمہ کے متعلق مولوی کریم الدین لکھتے ہیں[۱]

"ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے۔"

تحریر اقلیدس ۱۸۴۹ء میں ایک سو پچاس اور ۱۸۵۱ء میں تین سو کی تعداد میں طبع ہوئیں[۲] اس کا مطبوعہ نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔

۲۔ ترجمہ سنن ترمذی | چونکہ یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی اس لئے مولانا مملوک علی نے اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کیا[۳]

۳۔ تاریخ یمینی | تاریخ یمینی بھی دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی اس کا اردو ترجمہ بھی مولانا مملوک علی نے کیا اس کتاب کا خطی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے کتب خانہ میں موجود ہے[۵]

۴۔ عربی خط غیر منقوطہ | مولوی کریم الدین نے تذکرہ فرائد الدہر میں مولانا مملوک علی کا ایک عربی خط نقل کیا ہے جو انھوں نے شہزادہ فیروز شاہ کو لکھا تھا ـــــ

مولانا مملوک علی کے نامور فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔

---

[۱] تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۶۴

[۲] صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات از محمد عتیق صدیقی ص ۱۸۸، ۱۹۰ (انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء)

[۳] مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۲

[۴] تذکرہ اہل دہلی (سر سید احمد خاں) مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ص ۹۸ (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۵ء)

[۵] تاریخ یمینی کا اصل عربی میں ڈاکٹر اے۔ اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج نے ایڈٹ کیا (مرحوم دہلی کالج ص ۱۴۸) اس کتاب کا عربی سے فارسی میں ترجمہ مولانا فضل امام خیر آبادی نے کیا ہے جو ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی عنایت سے ہماری نظر سے گزرا یہ فارسی ترجمہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔